

شریعت کی تعبیر اور دستور کی اسلامیت اور کی بحث

ان دنوں مختلف حلقوں کی جانب سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کون سی شریعت پاکستان میں نافذ کی جائے گی؟ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بہت سے فرقوں اور شریعت کی بہت سی تعبیرات کی موجودگی میں کس کی تعبیر نافذ کی جائے گی، بالخصوص اب جبکہ بعض لوگوں نے شریعت کے نفاذ کے لیے ہتھیار بھی اٹھالیے ہیں؟ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ پاکستان کے دستور اور قانون کی رو سے پاکستان میں "عدلیہ کی شریعت" نافذ کی جائے گی۔ اس بات کی مختصر توضیح ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

دستور کی دفعہ 227(1) دو ذمہ داریاں عائد کرتی ہے:

اولاً یہ کہ "تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔" ثانیاً یہ کہ "ان احکام سے متصادم قانون سازی نہیں کی جائے گی۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی غیر اسلامی قانون نہیں بنایا جائے گا۔

پہلی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے دستوری تقاضوں کے مطابق اپنی رپورٹیں تیار کی ہیں۔ نیز جن بعض قوانین کی جزئیات احکام اسلام سے متصادم نظر آتی ہیں انہیں کالعدم قرار دینے کے لیے وقتاً فوقتاً وفاقی شرعی عدالت میں بھی کارخ کیا جاتا ہے۔

نئی یا مجوزہ قانون سازی کے متعلق دوسری دستوری ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے دستور کی دفعہ 229 میں جو طریق کار طے کیا گیا ہے اس کی رو سے مجوزہ قانون کے مسودے کی احکام اسلام سے ہم آہنگ بنانے کے لیے کونسل کی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ تاہم اگر مفاہم عامہ کا تقاضا ہو تو کونسل کا جواب موصول ہونے سے قبل بھی پارلیمنٹ مجوزہ قانون کا مسودہ منظور کر سکتی ہے۔ (دفعہ 229 (3)) وفاقی یا صوبائی مجلس ہائے قانون ساز اس بات کی پابند نہیں ہیں کہ وہ کسی مجوزہ قانون کا مسودہ لازماً کونسل کو بھیجیں، اور بالعموم وہ ایسا کرتی بھی نہیں ہیں۔ مقتضہ عام طور پر قانون سازی

* سابق پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ nyazee@yahoo.com

** اسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ mushtaqahmad@iiu.edu.pk

کے امور کونسل کی مشاورت کے بغیر ہی انجام دیتی ہے۔ اس وقت ہمارے لیے موضوع بحث یہی قوانین ہیں جو کونسل کی مشاورت کے بغیر بنائے جاتے ہیں۔

چونکہ اسلام سے متصادم کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا اس لیے اس دستوری امر کی پابندی کرتے ہوئے متفقہ قانون ایسا بناتی ہے جو اسلام سے ہم آہنگ ہو۔ پس مفروضہ یہ ہے کہ متفقہ کے بنائے ہوئے تمام قوانین اسلامی ہیں، خواہ انھیں وضع کرنے کے دوران میں کونسل سے مشورہ لیا گیا ہو یا نہیں۔ پس پاکستان میں تمام قوانین اسلامی ہیں۔ اگر ہم ان قوانین کو غیر اسلامی کہیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ متفقہ دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر اسلامی قوانین وضع کر رہی ہے۔ ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ کی متفقہ کے متعلق یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ پس یہ مفروضہ ماننا پڑے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں موجود تمام عدالتیں اس مفروضے کا ”عدالتی نوٹس“ لیں گی کہ متفقہ کے وضع کردہ تمام قوانین اسلامی ہیں۔

ذرا ترمیم شدہ شکل میں یہ مفروضہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل انگریزوں کی جانب سے بنائے گئے قوانین پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ کونسل اور شرعی عدالت نے تقریباً ان تمام قوانین کا جائزہ لیا ہے اور باہمیے معدودے چند مسائل کے سوا راجح الوقت تقریباً تمام قوانین کو اسلام کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔ جن چند قوانین کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے ان کو بھی بتدریج اسلامی قانون کے سانچے میں ڈھال دیا جائے گا جب ان کے متعلق کونسل کی رپورٹ آجائے گی، یا جب شرعی عدالت ان کے متعلق فیصلہ کر لے گی۔ قوانین کی غالب اکثریت کے متعلق کونسل اور شرعی عدالت، یا بہ الفاظ دیگر پاکستان کے عوام، کا مفروضہ یہ ہے کہ یہ اسلامی ہیں۔ پس عدالتیں ان قوانین کے متعلق بھی عدالتی نوٹس لیں گی کہ انھیں اسلامی فرض کرتے ہوئے ان کی تعبیر کی جائے۔

نئی قانون سازی اور پہلے سے راجح قوانین کے متعلق ان دو مفروضوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں موجود تمام قوانین اسلام سے ہم آہنگ کیے جاسکتے ہیں۔ مستقبل میں بھی جو قوانین بنائے جائیں گے وہ اسلام سے ہم آہنگ ہوں گے۔ پس قوانین کو اسلامیانے کا عمل تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور ہمارے تمام قوانین اسلامی ہیں۔ یہ حقیقت ہماری عدالتوں کے لیے نہایت اہم ہے۔ اب اس بات کی توضیح ضروری ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ عدالتیں ان مفروضوں کا اور اس اہم حقیقت کا عدالتی نوٹس لیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہے؟ اس مقصد کے لیے ہم امریکی جج جسٹس کارڈوز پر انحصار کریں گے جو ہمارے لیے عدالتی طرز عمل کی توضیح کرتے ہیں۔

جسٹس کارڈوز کہتے ہیں:

”پس ہمارے لیے پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ: جج جس قانون کا اظہار اپنے فیصلے کے ذریعے کرتا ہے وہ اسے کہاں سے حاصل کرتا ہے؟ بعض اوقات یہ ماخذ بالکل واضح ہوتے ہیں؛ [جیسے مثال کے طور پر کسی] جزیئے سے متعلق حکم دستور یا قانون فراہم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو جج کسی اور چیز کی طرف نہیں دیکھتا۔ جب متعلقہ حکم معلوم ہو جائے تو اس پر عمل پیرا ہونا ہی اس کا کام ہے۔ دستور قانون پر بالادست ہوتا ہے؛ لیکن

قانون اگر دستور سے ہم آہنگ ہو تو جج کے وضع کردہ قانون پر بلا دست ہوتا ہے۔ اس مفہوم میں جج کا وضع کردہ قانون متقنہ کے وضع کردہ قانون کی بہ نسبت ثانوی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ [تاہم [یہ] بھی صحیح ہے کہ ضوابط اور قوانین جج کو غیر ضروری نہیں بنا دیتے؛ نہ ہی اس کے کام کو لگا بندھا اور مشینی بنا دیتے ہیں؛ [بلکہ] قانون میں موجود خلاؤں کا پر کرنا ضروری ہوتا ہے؛ [اور اسی طرح] اشکالات اور احتمالات کا خاتمہ کرنا پڑتا ہے۔“ (The Nature of Judicial Process)

قانون میں جن خلاؤں، اشکالات یا احتمالات کا جسٹس کارڈوز و ذکر کر رہے ہیں وہ عام آدمی کی سوچ سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ جج کو ہر قانون کی تعبیر کرنی پڑتی ہے اور تمام خلاؤں، اشکالات اور احتمالات کو دور کر کے قانون کو شکل دینا اور معانی پہنانا ہوتا ہے جس کے بعد ہی وہ لوگوں کے مسائل کو منصفانہ اور متوازن حل دیتا ہے۔

یہ خلا، اشکال اور احتمال جن کا ذکر جسٹس کارڈوز و ذکر رہے ہیں، اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ تمام قوانین اب اسلامی ہو چکے ہیں۔ کیا یہ اشکالات دور کرنے میں ہمارے ملک کا قانون ہماری کچھ مدد کرتا ہے؟ یقیناً، کرتا ہے۔ اس مسئلے پر جس قانون کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن جس پر بوجہ عمل نہیں کیا جا رہا، "قانون نفاذ شریعت 1991ء" کی دفعہ 4 میں مذکور ہے۔ اس دفعہ کا متن حسب ذیل ہے:

”قوانین کی تعبیر شریعت کی روشنی میں کی جائے گی: اس قانون کے مقصد کے لیے (الف) جب کسی قانون کی دو تعبیرات ممکن ہوں تو عدالت وہ تعبیر اختیار کرے گی جو اسلامی اصولوں اور نظریہ؟ قانون سے ہم آہنگ ہو؛ (ب) جب دو یا زائد برابر کی تعبیرات ممکن ہوں تو عدالت وہ تعبیر اختیار کرے گی جو دستور میں مذکور پالیسی کے رہنما اصول اور اسلامی دفعات سے ہم آہنگ ہو۔“

ان دونوں ذیلی دفعات میں لفظ shall آیا ہے، نہ کہ may، اور اسی لیے اس حکم پر عمل لازمی ہے، نہ کہ اختیاری۔ "اس قانون کے مقصد کے لیے" سے بالبدراہت مراد یہ ہے کہ "نفاذ شریعت کے مقصد کے لیے، جیسا کہ اس قانون اور دستور کا تقاضا ہے۔" باقی رہا یہ سوال کہ اس لازمی تعبیر کی شکل عدالتی اصطلاح میں کیا ہوگی، تو اس کا جواب دینا خود عدالتوں پر ہی لازم ہے۔ قانون دان حضرات پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس دفعہ کی رو سے لازم ہونے والی تعبیر کے متعلق عدالتوں کے سامنے سوال اٹھائیں۔

اگر اس دفعہ کی روشنی میں قانون کی تعبیر شریعت کی روشنی میں کی جائے تو ملک کا پورا قانون اسلامی عدل اور انصاف کے رنگ میں رنگ جائے گا اور یہ رنگ چار پانچ سال میں واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ بعض اوقات عدالتیں شریعت کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن ایسا ہر معاملے میں نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ تمام قوانین کی تعبیر شریعت کے مطابق کی جائے۔ اس سے مراد ہر طرح کے قوانین ہیں، جیسے ٹیکس کا قانون، کمپنی کا قانون، معاہدے کا قانون، تلافی کا قانون وغیرہ۔ ہر قانونی تصور کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ قانونی تصور کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا مفہوم یہ ہے کہ خلاؤں کو پر اور اشکالات کو دور کرنے کا کام شریعت کی روشنی میں کیا جائے گا۔ اگر یہ قانونی لحاظ سے لازمی کام

1991ء میں شروع کیا جا چکا ہوتا تو آج ہم اس صورت حال سے دوچار نہ ہوتے کہ قانونی نظام کے اسلامی ہونے سے ہی انکار کیا جا رہا ہے۔ آخر میں اس بات کا بھی اضافہ کروں کہ شریعت کے با معنی نفاذ کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے نتیجے میں شریعت کا نفاذ تدریج اور سہولت کے ساتھ ہو جائے گا۔ آج جو لوگ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں انھیں نفاذ کے اسی طریقے پر اصرار کرنا چاہیے۔ ”کس کی شریعت کا نفاذ کیا جائے گا؟“ اس سوال کا جواب عدالتوں کو یہ کہہ کر دینا چاہیے کہ کسی فرقے کی شریعت نہیں، بلکہ شریعت کی دستوری شکل کا نفاذ کیا جائے گا۔

کیا ہمارا دستور اسلامی ہے؟

وفاقی حکومت نے ایک ممتاز عالم دین سے فتویٰ حاصل کیا ہے جس کی رو سے ہمارا دستور مکمل طور پر اسلامی ہے کیونکہ اس میں وہ ”اسلامی“ دفعات شامل ہیں جو اس ملک کے ممتاز علمائے کرام نے متنقہ طور پر تجویز کیے تھے۔ (ایکسپریس ٹریبون، ۹ فروری) سابقہ دستور میں ہم نے تجویز کیا ہے کہ محض قوانین وضع کرنے سے وہ اسلامی نہیں ہو جاتے؛ بلکہ یہ تبھی اسلامی ہوں گے جب عدالتیں ان کی اسلامی تعبیر کریں گی۔ زیر نظر دستور میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ان 22 نکات کی شمولیت سے دستور اسلامی نہیں ہو جاتا؛ دستور تبھی اسلامی ہوگا جب عدالتیں صرف ان 22 نکات کی ہی نہیں بلکہ دستور کی ہر ہر دفعہ کی اسلامی تعبیر کریں گی۔

سوال یہ ہے کہ عدالتیں کیوں دستور کی اسلامی تعبیر نہیں کر رہیں؟ ہمارے علمائے کرام اور صحافی حضرات کو، جو اس موضوع پر لکھ رہے ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ اگر عدالتیں دستور کی ہر شق کی اسلامی تعبیر نہیں کر پار ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب عدالت عظمیٰ نے حاکم خان بنام حکومت پاکستان میں دیا ہے۔ (PLD 1992 SC 559) اس مقدمے میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ قصاص کے مقدمات میں قاتل کی معافی کا اختیار صرف مقتول کے ورثا کے پاس ہے یا ورثا کی مرضی کے بغیر بھی صدر قاتل کو معاف کر سکتا ہے؟ دستوری اصطلاح میں بظاہر دفعہ 2- الف، جو دستور کو اسلامی بنانے کی کوشش کرتی ہے، اور دفعہ 45، جو صدر کو ہر سزا کی معافی کا اختیار دیتی ہے، کے درمیان تضاد تھا۔ اگر یہ فرض کرتے ہوئے کہ دستور اسلامی ہے، دفعہ 45 کی بھی اسلامی تعبیر کی گئی ہوتی تو معزز عدالت نے قرار دیا ہوتا کہ دفعہ 45 کا اطلاق قصاص کی سزا پر نہیں ہوتا۔ تاہم عدالت نے یہ نہیں کہا۔ اس کے برعکس اس نے قرار دیا کہ دفعہ 2- الف ”دستور پر حاوی“ نہیں ہے اور دفعہ 2- الف دستور کی کسی دوسری شق کی تخصیص یا تنقید نہیں کر سکتی۔ بہ الفاظ دیگر، صرف وہ 22 نکات ”ہی اسلامی ہیں؛ باقی ہر شق اپنا انفرادی مفہوم رکھتی ہے۔

پورے دستور کو اسلامی بنانے کا طریقہ پھر کیا ہے؟ معزز عدالت نے اس کے لیے یہ طریقہ بھیایا ہے: پس اگر دستور کی موجودہ شقوں میں سے کسی کے متعلق یہ سوال اٹھایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ جن حدود کے اندر لوگوں کو قانون سازی کا اختیار ہے یہ شق ان حدود سے تجاوز کی بنا پر ناجائز ہے، تو اس مسئلے کا حل صرف مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے پاس ہے جو اگر اس رائے سے متفق ہو تو متعلقہ شق کو ٹھیک کر کے اسے واپس اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود

کے اندر لانے کے لیے مناسب ترمیم کر سکتی ہے۔ (PLD 1992 SC 559, 621)

یہ موقف دستوری لحاظ سے انتہائی دور رس نتائج کا حامل ہے اور اس کا تفصیلی تجزیہ ضروری ہے۔

برطانیہ میں دستور عام قوانین کی صورت میں بکھرا پڑا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہاں [یکجا صورت میں] تحریری دستور موجود نہیں ہے۔ دستور کی جگہ وہاں پارلیمنٹ کا فیصلہ بالا دست حیثیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر وہاں جج کہا کرتے تھے کہ: "ہم ملکہ عظمیٰ اور پارلیمنٹ کے معزز اراکین کے خادم ہیں۔" چنانچہ کسی قانون میں ترمیم کی ضرورت ہوتی تھی تو جج اسے واپس پارلیمنٹ بھیجا کرتے تھے۔ تعبیر قانون کے لیے وہ لفظ کے ظاہری مفہوم پر اصرار کرتے تھے اور قانون میں اپنی جانب سے کسی مفہوم یا پہلو کا اضافہ نہیں کرتے تھے۔ تمام فیصلے پارلیمنٹ سادہ اکثریت کے ذریعے کرتی تھی۔ جہاں تحریری دستور ہو، جیسا کہ امریکا میں ہے، وہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔ برطانیہ میں بھی اب یہ موقف بتدریج تبدیل ہوتا جا رہا ہے اور وہاں بھی جج بعض اوقات مدون دستور کے مفروضے پر عمل کرتے ہیں۔

غیر مدون دستور کے برعکس تحریری طور پر مدون دستور قانون کے ماخذ کے درمیان ترتیب مقرر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں تحریری دستور کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ دستور کو عام قانون پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بالادستی کے مفروضے کی بنا پر عدالتوں کے لیے یہ اختیار تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ دستور سے تصادم کی بنیاد پر قوانین کو کالعدم قرار دیں۔ پاکستان میں بھی ماضی قریب میں عدالت عظمیٰ نے اس قاعدے کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ چونکہ برطانیہ میں قوانین کے درمیان اس نوعیت کی ترتیب کا عنصر مفقود ہے، اس لیے وہاں عدالتوں کے پاس اس طرح کا اختیار موجود نہیں جس طرح امریکا میں ماربری بنام میڈیسن کے مشہور مقدمے سے عدالت عظمیٰ نے حاصل کیا۔ برطانیہ میں یہ عدالتی اختیار صرف انتظامی فیصلوں کے جائزے تک ہی محدود ہے۔ اگر ہم اپنے دستور کی شقوں کے مفہوم کے تعین اور اسلام کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کا فیصلہ کرنے کے لیے اسی طرح پارلیمنٹ کی طرف بھیجیں گے تو اس سے قوانین کے درمیان اس ترتیب اور عدالتوں کے اس اختیار کی نفی ہوتی ہے جسے ہمارے دستور نے تسلیم کیا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حاکم خان کیس میں معاملہ پارلیمنٹ کی طرف بھیجنے کے بجائے اگر عدالت عظمیٰ نے اپنے اس اختیار کا استعمال کیا ہوتا تو وہ یہ فیصلہ بھی سناسکتی تھی کہ مقتول کے ورثا کے پاس قاتل کو معاف کرنے کا حق دستور کی دفعہ 45 سے متصادم ہے! عدالت نے ایسا نہیں کیا اور پورا معاملہ پارلیمنٹ کی طرف بھیج دیا۔ پارلیمنٹ نے دستور میں ترمیم کرنے کے بجائے مجموعہ تعزیرات پاکستان میں ایک نئی شق کا اضافہ کیا۔ چنانچہ 1997ء میں اس مجموعے کی دفعہ 54 میں، جو سزاؤں کی معافی کے بارے میں حکومت کے اختیار کے بارے میں ہے، حسب ذیل ترمیم کی گئی: "البتہ اگر مجرم کو قتل کے کسی جرم میں سزائے موت سنائی جاتی، تو مقتول کے ورثا کی مرضی کے بغیر ایسی سزا میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کام عدالت نہیں کر سکتی وہ عدالت نے ایک عام قانون کے ذریعے کر دیا کہ اس نے دستور کی دفعہ 45 کی تخصیص ایک عام قانون کے ذریعے کی۔ گویا دستور میں ترمیم سادہ اکثریت کے ذریعے کی گئی!

دفعہ 45 کی تخصیص اس طریقے سے، یعنی ایک عام قانون کے ذریعے، کی گئی حالانکہ اس کے الفاظ عام ہیں اور اس

میں ”قانون کے تحت“ جیسی کوئی ترکیب بھی استعمال نہیں کی گئی۔ اگر اس کے باوجود پارلیمنٹ یہاں یہ کر سکتی ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات کے ساتھ وہ کیا کچھ کر سکے گی کیونکہ ان دفعات میں تو یہ ترکیب بھی استعمال کی گئی ہے! مثال کے طور پر ”مفاد عامہ کی خاطر قانون کے تحت عائد کی گئی مناسب قید کے اندر“ (دفعہ 15)، ”نظم اجتماعی کے مفاد کی خاطر قانون کے تحت عائد کی گئی مناسب قیود کے اندر“ (دفعہ 16)، ”قانون کے تحت عائد کی گئی مناسب قیود کے اندر“ (دفعہ 17) چنانچہ پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے بنیادی حقوق پر کئی قیود عائد کر سکتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دفعات میں پنکچر لگے ہوئے ہیں۔ (پنکچر میں کسی اور بات کی طرف تلیخ نہ بھی جائے)۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر صدارتی اور دیگر نوعیتوں کی استثنائے سے متعلق دفعہ 248 کا جائزہ اسلامی قانون کی روشنی میں لیا گیا تو اس کی تعبیر کیسی ہوگی؟ افسوس کی بات یہ ہے کہ ماضی قریب میں جب عدالت میں اس دفعہ پر بحث ہو رہی تھی تو اس پہلو کو نظر انداز کیا گیا۔ تاہم دفعہ 6 تو اس وقت بھی عدالتوں میں زیر غور ہے۔ ہمارے دستور کی اسلامیت جانچنے کا یہ ایک اور موقع ہے۔ ہمیں انتظار ہے اس بات کا کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں عدالت ”عداری“ کا کیا مفہوم متعین کرتی ہے؟

پس بنیادی نکتہ یہ ہے کہ محض قانون سازی کافی نہیں ہے؛ نہ ہی قوانین میں محض یہ تصریح کرنے سے کہ یہ اسلامی ہیں، کام چل سکتا ہے۔ دستور یا قانون میں اسلامی دفعات کی شمولیت سے صرف آدھا کام ہی ہوا ہے۔ اصل میں اہمیت اس امر کی ہے کہ عدالتیں دستور اور قوانین کی تعبیر کس طرح کرتی ہیں۔ شاید حاکم خان کیس کا فیصلہ اب بھی نافذ ہے۔ تاہم اسلامی قانون کی روشنی میں دستور کی عدالتی تعبیر کی راہ میں یہ فیصلہ رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

1898ء کے ایک فیصلے کی بنا پر 1966ء تک انگلستان میں برطانوی دارالامراء پر خود اس کے اپنے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ یہ اصول پہلی دفعہ لندن سٹریٹ ٹرام ویز بنام لندن سٹی کونسل کے مقدمے میں طے کیا گیا۔ دارالامراء نے قرار دیا کہ ”کسی قانونی امر کے متعلق اس ایوان کا فیصلہ حتمی ہے اور..... پارلیمنٹ کے قانون کے سوا کوئی چیز بھی اس ایوان کے فیصلے میں موجود کسی مزعومہ غلطی کی تصحیح نہیں کر سکتی“۔ 1966ء میں دارالامراء نے ایک ”تعال کی دستاویز“ کے ذریعے یہ موقف تبدیل کر لیا اور قرار دیا کہ ”ایوان کے سابقہ فیصلوں کو عام طور پر لازمی ماننے کے باوجود ایوان ان سے انحراف کر سکتا ہے اگر اسے یہ انحراف صحیح معلوم ہو“۔ پس اس وقت زیادہ سے زیادہ جو کچھ چاہیے وہ صرف عدالت عظمیٰ کی جانب سے جاری کردی ایک ”تعال کی دستاویز“ ہے جس میں یہ قرار دیا جائے کہ آج سے پاکستان کے دستور اور قوانین کی تعبیر اسلامی قانون کی روشنی میں کی جائے گی۔ اس کے بعد کوئی یہ سوال نہیں کر سکے گا کہ کیا پاکستان کا دستور اسلامی ہے؟